انڈین ہسٹری اینڈ کلچر سوسائٹی اجلاسِ دوم کا خطبۂ صدارت

از: پروفیسر خلیق احمد نظامی
مترجم: جناب محمد یٰسین مظہر صدیقی

رفیق مسند دبین، خواتین و حضرات!

انڈین ہسٹری اینڈ کلچر سوسائٹی کے بانی اراکین نے اپنی سوسائٹی کے اجلاس دوم کی صدارت کے لئے مجھے منتخب کرکے میری جو عزت افزائی کی ہے اس کا مجھے گہرا احساس ہے۔ سوسائٹی نے اپنی زندگی کا ابھی صرف ایک سال پورا کیا ہے لیکن اس نے جن آدرشوں اور مقاصد کو جلا بخشی ہے اس کی بنا پر اس کے قیام کو وقت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل سے بجا طور پر تعبیر کیا گیا ہے۔ جس وقت کہ ہمارے ملک کی تاریخ کی از سرِ نو تشکیل کی جارہی ہے سوسائٹی کے قیام نے مورخوں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائی ہیں اور ان کو آگاہ کیا ہے کہ ہندوستانی تاریخ کا یہ لمحہ کون سا ہے اور ہم کس طرف جارہے ہیں؟ اس کا کردار منفی نہیں ہے کہ بعض دوسروں کی غلطیوں اور فروگذاشتوں کی پکڑ کی جائے بلکہ اس حقیقت کو تعمیری اور مثبت انداز سے اجاگر کرنا ہے کہ تاریخ بنیادی طور سے سچائی کی ایک تلاش ہے اور چونکہ سچائی بجائے خود ایک اعلیٰ قدر ہے لہٰذا اس کو کسی دوسری قدر کے تابع نہیں کیا جاسکتا چاہے وہ کتنی ہی محترم یا مقدس کیوں نہ ہو۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ تاریخ کو جس طرح قومیت، گروہ بندی، فرقہ واریت، علاقائی عصبیت اور تنگ نظری کے اوہام سے آزاد کرایا جائے اسی طرح نظریات کے درآمد شدہ خاکوں کے تسلط سے بھی نجات دلائی جائے جن کو ہندوستانی تاریخ پر بلا سوچے سمجھے منطبق کر دیا جاتا ہے اور جو تاریخی تناظر کو دھندلا کر دیتے ہیں۔ اور تاریخی مطالعوں کے لیے جو راہیں سیاست کے زیر اثر متعین کی گئی ہیں ان کی قربان گاہ پر سچائی کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

چونکہ سوسائٹی کا یہ اجلاس بنیادی طور سے دو موضوعات "ہندوستانی تاریخ نگاری میں

تعصب" اور "نئے مآخذ" سے بحث کرے گا۔ اس لئے میں بھی اس خطبہ میں انہیں دونوں موضوعات تک محدود رہنا چاہتا ہوں۔

ہندوستان کی جدید تاریخ نویسی اپنے آغاز کے لئے برطانوی دانشوروں کی مرہون منت ہے جنھوں نے ملک پر اپنے تسلط کے فوراً بعد ہندوستان کی تاریخ، معاشرت اور تمدن کے مطالعہ پر اپنی تمام ذہنی کاوشیں صرف اپنے استعماری تقاضوں اور محرکات کے پیش نظر صرف کیں۔ اگرچہ ہندوستان کے آثار قدیمہ، دستاویزات اور تاریخی ادب کو محفوظ کرنے کرنے برطانوی مورخوں نے جو کوششیں کیں ان کو کسی بھی دیانتدارانہ تجزیہ میں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تاہم یہ بھی ناقابل انکار ہے کہ ان کے نوآبادیاتی مقاصد و مصالح نے ان کے تاریخ کے مطالعہ کی راہیں متعین کی تھیں۔ ہندوستان کے عہد وسطی کی تاریخ کو عوام کے سامنے پیش کرنے کے بارے میں سر ہنری ایلیٹ کا خیال یہ تھا کہ "ہماری دیسی رعایا کو ان بیش بہا فوائد کا احساس و ادراک کرایا جائے جو ان کو ہماری حکمرانی کی نرم روی اور انصاف کے تحت حاصل ہو رہے ہیں۔" (جلد اول ص ۲۲)
چنانچہ اس نے برطانوی "حال" کو روشن کرنے کے لئے ہندوستان کے "ماضی" کو تاریک بنا دیا اور وسطی عہد کے ہندوستان کی تاریخ کو "ہندوستانیوں کو ہندوستانیوں کے خلاف استعمال" کرنے کے اصول کو بروئے کار لانے کے ایک آلہ کے طور پر استعمال کیا جس کو برطانوی آرمی کیفیت سے جنم دیا تھا۔ انگلستان کی حکومت کے نام سر ہنری ایلیٹ کی یادداشت اس کے مقاصد کو واشگاف طور پر واضح کرتی ہے۔ اس کو "ہندوستان کے حکمراں کی حیثیت سے اپنے اعلیٰ اقتدار" کا زبردست احساس تھا اور یقین تھا کہ اگر وسطی عہد کے ہندوستان کے "مطلق العنان حکمرانوں کے ظلم اور فرعون مزاجی" کو اس انداز سے زیر بحث لایا جائے تو ہندوستانی اپنے ماضی سے خوفزدہ ہو جائیں گے اور برطانوی حکومت کو ایک برکت تصور کریں گے۔ ایلیٹ نے لکھا تھا کہ "ہم آشفتہ زبان دراز بابوؤں کو جو ہماری حکومت کے زیر سایہ شخصی آزادی کے اعلیٰ ترین درجہ سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور دوسری بہت سی سیاسی مراعات بھی ان کو حاصل ہیں جو کسی مفتوح قوم کو کبھی عطا نہیں کی گئیں قوم پرستی

کے بارے میں بڑھ چڑھ کر باتیں بناتے نہ دیکھیں۔ اگر وہ ان جلدوں کا مطالعہ کریں گے جن کا ذکر یہاں کیا گیا ہے۔۔۔ تو وہ جانیں گے کہ اس تاریک دور کے جن ایام کی واپسی کی حسرت کرتے ہیں ان میں ان کمان ناقابلِ یقین واہموں کے محض زبانی اظہار پر ان کی کتنی گرفت ہوتی، نہ صرف خاموشی اور حقارت کی نظر سے بلکہ اس سے کہیں زیادہ سخت پگھلے سیسہ یا۔۔۔۔ کی سزا سے ہم کو لگان معاف آراضی کے خاتمہ کے خلاف مزید شور و غوغا بھی سننے کی حاجت نہیں۔۔۔۔" ہندوستان میں برطانوی حکومت کا استعماری مقاصد پورے کرنے کی غرض سے سر ہنری ایلیٹ نے ہماری تاریخ کے تناظر کو مسخ کیا۔ اور اپنی دریدہ تحریفوں سے ہماری قومی زندگی کے سرچشموں کو زہر آلود بنا یا۔ ہندوستانی تاریخ پر لکھی جانے والی درسی کتابوں کا ماخذ نسلوں تک یہی کتابیں رہیں اور ایلیٹ کے باریک بینی سے داخل کئے ہوئے جراثیم نے تین نسلوں کے نقطۂ نظر کو خطرناک طور پر متاثر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ "زبان دراز بابو" قرون وسطی کی واپسی کے لئے نہیں بلکہ "ایک نئے عہد" میں داخلہ کیلئے شور و غوغا مچا رہے تھے اور وہ ایلیٹ کے طرز کے اینگلو انڈین نظامِ حکومت کے لئے یقیناً ناقابلِ فہم تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں رائیس ڈیوس کی اس زبردست شکایت کے باوجود کہ نصف صدی کی یونیورسٹی تعلیم کے بعد بھی ہندوستانیوں نے ہندوستان کی تاریخ کے لئے کوئی قابلِ قدر کارنامہ نہیں انجام دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ صدی کی پہلی تین دہائیوں میں جادو ناتھ سرکار، بھنڈارکر، راناڈے۔ سلیمان ندوی، تاراچند، محمد حبیب، رام پرساد ترپاٹھی اور متعدد دوسرے ہندوستانی مورخوں نے ایسی کتابیں تصنیف کیں جو انداز بیان و طرز ادا کی تازگی کے لئے ممتاز تھیں اور جنھوں نے استعماری مورخین کے پیدا کردہ فرقہ وارانہ تعصب سے ہندوستانی تاریخ کو نجات دلائی۔

آزادی کی صبح کے ساتھ ہندوستانی تاریخ نویسی ایک دوسرے دور میں داخل ہوئی لیکن ملک کی تقسیم کے ایک بدبختانہ تلازمہ کے طور پر بیشتر تاریخی تصانیف نے فرقہ وارانہ لہجہ اختیار کر لیا اگرچہ اس کا ردِ عمل ہونا ناگزیر تھا تاہم وہ عارضی اور چند روزہ ہی رہا۔ جب ہندوستانی تاریخ نویسی اس صورت حال سے نکل رہی تھی کہ ایک نعرہ لگایا گیا "نظریہ کے بغیر تاریخ نہیں" اور ایک

درآمد شدہ نظریہ کے جال میں ہندوستان کے تاریخی مطالعوں کو کس دینے کی کوشش کی گئی ۔ اس میں ہرگز کوئی حرج نہیں کہ تاریخ کے مختلف نظریات کو بطور آلات استعمال کیا جائے تاکہ تاریخی مواد کی مختلف زاویوں سے تشریح کی جائے لیکن جب قرون وسطیٰ کے تقلید پسندی کے انداز میں کہ جس کے مطابق ہر مذہب صحیح عقیدہ کے واحد علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتا تھا اور دوسرے تمام مذاہب کو گمراہ قرار دیتا تھا اس نئے نظریہ کے حامی اور علمبردار بھی یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیں کہ صرف وہی صحیح تاریخی انداز تحریر کی نمائندگی کرتے ہیں اور بقیہ دوسرے یا تو نااہل ہیں یا فرقہ پرست یا رجعت پسند تو یہ ذہنی آزادی کے لئے ایک خطرہ کی علامت بن جاتی ہے ۔ اس انداز میں جن مصنفوں کی مذمت کی گئی ہے ان میں سے بیشتر نہ تو نااہل تھے اور نہ ہی رجعت پسند ۔ ان کی واحد خطا یہ تھی کہ انھوں نے ان کے نظریہ کو اپنے عقیدہ کے ایک رکن کے طور پر قبول نہیں کیا تھا ۔ تاریخ کا مارکسی نظریہ بلاشبہ دلچسپ اور خیال افروز ہے لیکن دوسرے تمام راستوں کو غیر سائنٹفک قرار دینا، تحقیق، تلاش اور تعبیر کی آزادی کو سلب کرنے کے خطرناک نتائج سے بھرپور ہے ۔ ہر ملک کی اپنی تاریخی روایات ہوتی ہیں اور اس کے ماخذی مواد کی جڑیں بنیادی طور پر ان لوگوں کے رواجوں اور روایات میں پیوست ہوتی ہیں جو اس کی تخلیق کرتے ہیں اور ان کی جانچ پڑتال صرف انھیں کے نظریاتی دولت کی روشنی میں کی جا سکتی ہے ۔ ان تمام چیزوں کو نظر انداز کر کے تاریخی فکر کو اس طرح محدود کر دینا کہ وہ صرف طبقاتی کشمکش کے گرد چکر لگائے اور اسی کو تلاش کرتی رہے اور صرف معاشی پہلوؤں پر ختم کر رہ جائے اور مذہب، تمدن، فکر اور روایات کے بقیہ دوسرے پہلوؤں کو جو زیادہ اہم نہ سہی تاہم مساوی طور پر اہم ضرور ہیں، خارج از بحث قرار دے دینا ہندوستانی تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہے ۔

ایملی دورخم کا یہ خیال کہ مذہب ایک اعلیٰ تمدن کا سرچشمہ ہوتا ہے، ہندوستان پر پوری طرح صادق آتا ہے ۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جو مذہبوں کا گہوارہ رہا ہے اور جہاں رشیوں، بھگتوں گروؤں، صوفیوں اور دوسرے مردانِ حق نے اخلاقی اور روحانی آدرشوں کی تعلیم دی اور جنھوں نے مادی مشاغل کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا ہے ۔ ایسے ملک کی تاریخ کی تشریح و تعبیر محض معاشی ضروریات

کی اصطلاح میں کی جائے تو نہ صرف یہ کہ ہندوستانی قوم کی تمناؤں اور آرزوؤں بلکہ ان کی روح اور ان کی فکر کے دھارے کو کبھی بھی صحیح طریقے سے نہیں سمجھا جا سکے گا۔ صورتِ حال اس وقت اور بھی خطرناک حد تک پریشان کن بن جاتی ہے جب ایک سیاسی تنظیم کو ان کے نظریہ کی تبلیغ کے لئے ساز و سامان فراہم کیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی اور اس کے عمل کو محض پیداوار کے ذرائع کے سیاق و سباق میں نہیں اجاگر کیا جا سکتا۔ مذہب، نفسیاتی، سماجی، اخلاقی اور ماحول کے اسی طرح کے اور بہت سے متنوع عناصر انسانی رویہ پر اثر انداز ہوتے ہیں جو مختلف حالات میں عمل اور ردعمل کے ایک پیچیدہ مظہر کا نام ہے۔ انسانی شخصیت اور اس کے تمام محرکات کو محض اس کی معاشی ضروریات تک محدود کر دینا نہ تو نفسیاتی لحاظ سے قابلِ ثبوت ہے اور نہ معاشرتی اعتبار سے۔ میکس ویبر اس خیال سے کہ ہر چیز مادی عناصر سے جنم لیتی ہے بجا طور پر اختلاف کرتا ہے۔ تاریخ دراصل زمان و مکان میں انسانی تجربات کی کلیت سے تعلق رکھتی ہے اور ایسا ہی اس کو عملی طور پر ہونا بھی چاہیئے۔ تب ہی سماج کی ایک مکمل تصویر اور تاریخ کا صحیح تناظر پیدا ہو سکتا ہے۔ تاریخ افراد کی سرگزشت ہو یا نہ ہو مگر وہ بلاشبہ اقوام اور تہذیبوں کی سرگذشت ہے جو افراد کی مانند "یادداشت" رکھتی ہے۔ اور جو ان کی ضروریات، ان کی روایات حتیٰ کہ ان کی غلطیوں میں بھی اسی طرح جاری و ساری رہتی ہے جیسے کہ ان کی آرزوؤں اور آدرشوں میں۔ .... نے ایک بار کہا تھا "ایتھنز میں یونانی ایک مصری مندر کو اس سے زیادہ نہ پسند کرتے جتنا کہ مصری میمفس میں ایک یونانی مندر کو پسند کرتے۔ یہ دونوں یادگاریں اگر اپنے ماحول سے کٹ جائیں تو ان کی اصل خوبصورتی ضائع ہو جائے گی جو اس قوم کے اداروں اور عادتوں کی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔" یہی بات کسی ملک کی تاریخی روایات پر بھی صادق آتی ہے۔ آپ ان کو ان کے ماحول سے ہٹا دیں تو ان کی اہمیت ختم ہوئی۔ پیداوار کے ذرائع یقیناً حالاتِ زندگی کو متاثر کرتے ہیں لیکن سماجی نظام اور نظریاتی مواد بھی انسانی کوششوں کا رخ متعین کرنے میں کارگر عناصر ثابت ہوتے ہیں۔ تاریخی مطالعات کو نظریاتی قیود کی محدود وسعتوں

میں موڑنے کی بعض مصنفین کی کوششیں اس خوف کی یاددہانی کراتی ہیں جن کا اظہار لارڈ مورلے نے اپنے زمانہ کے تاریخی مطالعوں کے بارے میں کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ "ہمارے زمانے میں اس مکاتب تصورِ تاریخ کے تنگ، نظریہ پرستانہ اور ادھورے ہونے کے اثرات نمایاں ہونے لگے ہیں۔ اس سے خطرہ یہ پیدا ہوچلا ہے کہ وہ انسانی سماجوں کے عظیم عہدوں اور تحریکوں کے ایک وسیع مطالعہ کے بجائے محض غیر اہم حقائق، سطحی علم اور بیہودہ اثریات سلف کے لامحدود ادوار بے کراں مجموعہ میں تبدیل ہوکر نہ رہ جائے جس میں عہدوں کی روح کھو جاتی ہے اور انسانی تاریخ کے مختلف دھاروں کی سمت، معنی اور لب لباب سب گم ہوجاتا ہے۔"

تیسری دہائی کے آغاز کا زمانہ تھا جب پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے فرمایا تھا کہ "ہندوستان کی تاریخ، جیساکہ اسے ہندوستانیوں نے سمجھا ہے اس مذہبی اور تہذیبی تحریکوں کی تاریخ ہے۔" اپنی بعد کی ایک اور تصنیف میں انھوں نے اپنے اس خیال کی تشریح اسطرح کی ہے؛ "ماضی میں تاریخ کے اہم موڑوں پر مذہب نظریاتی انقلاب کا ایک عظیم ذریعہ رہا ہے۔ اسی میں اس کی اصل قدر و قیمت پوشیدہ ہے۔ مذہب کی مارکسی مذمت اب مجموعی طور پر ضروری نہیں ہے۔ ہم کو زمان و مکان کے اعتبار سے امتیاز کرنا چاہیئے۔ انسانی سماج کے بہت سے ایسے شاندار کام ہوئے ہیں جن کو صرف مذہب ہی انجام دے سکتا تھا۔"

ہندوستانی تاریخ کا کیا بنے گا اگر اس میں مذہب کی تمام بحثوں کو حرام قرار دے دیا جائے اور تمام تاریخی حقائق کی تشریح مادی جدلیت کی اصطلاح میں کی جائے۔

دوسرے مآخذ پر مبنی نتائج کی جانچ پڑتال کے لئے اعداد و شمار کی کھیتونی ایک قابلِ قدر ذریعہ ہے لیکن تاریخی ضابطہ سازی کا یہی واحد طریقہ نہیں ہے۔ انسانی رویہ یکساں حالات میں مقدار و کمیت کے تجزیہ کا ماتحت نہیں ہوتا اور نہ ہی بار بار جانچ پڑتال کا۔ اسی بنا پر ہر قسم کی تعمیم بھروسہ کے قابل نہیں ہوتی۔ جیساکہ فنلے نے کہا ہے کہ مارکسیت انسانی رویہ کو مسخ کر دیتی ہے کیوں کہ وہ اس کو ایک وحدت پرستانہ نظریہ بنا کر رکھ دیتی ہے۔ سماجوں میں اختلاف

اور اتفاق دونوں رونما ہوتے ہیں اور ایک سچی تصنیف کو انسانی فطرت کے ان دونوں پہلوؤں کو پیش کرنا چاہیئے۔

اسی طرح ہندوستان میں صدیوں کے اندر پروان چڑھنے والے تاریخی واقعات کی یک رخی تصویر نہ تو مناسب ہے نہ ہی حق بجانب، کیونکہ فکر انسانی میں بھی انسانی سماج کے مانند نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات ہندوستانی تاریخ کے مخصوص پہلوؤں کا مطالعہ کرنے میں مارکسی طریقے معاون ثابت ہوئے ہیں۔ جیسے انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کا معاشی استحصال اور برطانیہ کے صنعتی نظام میں "ہندوستانی خراج" کا حصہ۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ جدید ہندوستان کے تاریخی واقعات پورے کے پورے یک رخی رہے تھے۔ اگر یہاں کسانوں کی بغاوتیں ہوئیں تو ساتھ ہی مغرب کے مذہبی اور تہذیبی اداروں کے پھیلاؤ کے خلاف سماجی اور مذہبی ردعمل بھی ہوئے ہیں۔

اسی کے مانند ہندوستان کی تاریخ کو تقلید پسندی، آزاد خیالی یا مذہبی ضابطہ بندی اور سیکولرازم کی تاریخ قرار دینا بھی بنیادی طور پر نامناسب ہے۔ یہ دعویٰ غلط نتیجہ پیدا کرتا ہے کہ اگر کسی سماج میں غیر دینی سمت میں زیادہ سرگرمی نظر آتی ہے تو مذہبی سمت میں اسی کے متناسب قوت میں کمی ہونی چاہیئے۔ بکسٹر کا نظریہ ہے کہ یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ کسی ایسے قطب کی جانب سماجی قوت کا بہاؤ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اسکی مختلف سمت میں قوت کا بہاؤ رک جائے۔"

پولارڈ کی تصنیف "جدید تاریخ میں عناصر" (Factors in Modern History) پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے بہت صحیح کہا ہے کہ "اگر ہم (قطبی نقطۂ نگاہ کو) اپنالیں تو ہم الجھن کو دعوت دیں گے۔ اگرچہ ایک جوڑے کے دو ارکان کے درمیان تناؤ ہوتا ہے لیکن معاملہ "یہ یا یہ" کا نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمیشہ "زیادہ یا کم" کا ہوتا ہے۔ سوال یہ نہیں ہوتا کہ ایک دوسرے کو کس طرح ہڑپ کر جاتا ہے بلکہ یہ کہ ان کے درمیان کس طرح ایک قابلِ عمل توازن قائم کیا جائے اور مختلف حالات میں کس طرح ہم آہنگی اور مصالحت کی شرائط از سرِ نو پیدا کی جائیں"

انسانوں اور تحریکوں کی مستقل گروہ بندی یا جماعت بندی تاریخ میں ان کے اصل کردار کو سمجھنے میں رکاوٹ بنتی ہے ۔ اصل میں کسی فرد یا جماعت یا فرقہ کو ایسے کسی طبقہ میں مستقل نہیں رکھا جا سکتا ہے ۔ مثلاً شیخ احمد سرہندی اور ان کے مکتب فکر کو دقیانوسیت کا نمائندہ قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ بالکل بھلا دیا جاتا ہے کہ ان کے ایک روحانی شاگرد مرزا مظہر جان جاناں نے اس وقت ایک عظیم روحانی قوت متحرکہ اور روحانیت کا ثبوت دیا جب انھوں نے ہندوؤں کو اہل کتاب میں شامل قرار دیا اور ویدوں کو الہامی کتب گردانا ۔ دارا شکوہ جو اپنے زمانہ میں آزاد خیال فکر کا سب سے بڑا ترجمان تھا شیخ احمد سرہندی کی شان میں زبردست قصیدہ پڑھتا ہے ۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو شیخ احمد سرہندی کے جدید نقاد مشکل ہی سے سمجھ یا بیان کر سکتے ہیں ۔ دراصل ہم کو ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھتے وقت اپنے جدید زمانے کے تعصبات اور رجحانات کو اس میں نہیں داخل کرنا چاہیئے آج دقیانوسیت یا روشن خیالی کا جو تصور ہم رکھتے ہیں ہو سکتا ہے کہ وہ اس وقت اسی مفہوم کے ساتھ موجود نہ رہا ہو ۔ انیسویں صدی کے فرانس میں آزادی کچھ اور تھی اور پانچویں صدی عیسوی کے ایتھنز میں اس سے قطعی مختلف تھی ہمارے موجودہ خیالات کو ماضی کے مطالعہ پر اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہیئے ۔ ماضی کو صرف ماضی کے سیاق و سباق میں پرکھنا چاہیئے ۔

مجھ کو چند مثالیں بیان کرنے کی اجازت دیجئے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ جزوی یا نامکمل حقائق سے کس طرح غلط بیانی جنم لیتی ہے

یہ کہنا کہ محمود غزنوی نے ہندوستان پر معاشی وجوہ سے حملے کئے بجا ہے لیکن یہ غلط بیانی ہے اگر بات یہیں ختم ہو جائے ، اسی کے ساتھ یہ بھی کہنا چاہیئے کہ اس نے ہندوستانی مندروں کو بھی مسمار کیا لیکن اس سے بھی تصویر مکمل نہیں ہوتی اس میں اتنا اور بڑھانا چاہیئے کہ اس کے معاصر صوفی ابوالحسن بولانی نے سومنات سے حاصل شدہ سونا قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا کیوں کہ ان کے خیال میں سلطان* کی مہم رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتی تھی محمود کی تصویر اس وقت مکمل ہوگی جب اس کا مزید اضافہ کیا جائے کہ مشہور فارسی شاعر سعدی محمود کو حریص اور لالچی تصور کرتے

تھے اور اس کے معاصر البیرونی نے کہا تھا کہ محمود کے حملوں نے ہندوستانی ذہن میں اسلام کے خلاف تلخی پیدا کر دی تھی۔ ان پہلوؤں میں سے کسی کو چھپانے کی کوشش تاریخ کو مسخ کر دے گی اور صحیح تجزیہ کی راہ میں حائل ہو گی۔

اکبر بلاشبہ ایک روشن خیال حکمراں تھا جس نے سیاسی اور معاشی مفادات کی یکسانیت کی اساس پر ایک ہندوستانی سلطنت قائم کرنی چاہی تھی۔ لیکن اس کے خلاف رانا پرتاپ کی جدوجہد کو کیوں دبا یا جائے یا مذہبی تعصب کے نقطۂ نظر کو سمجھنے سے کیوں انکار کیا جائے۔ مغل سلطنت کو ایک ملک گیر ہندوستانی کردار اور رنگ و روپ دینے کی کوششیں یقیناً قابلِ داد ہیں لیکن اس سے کیوں انکار کیجیے کہ اس کی مذہبی قیادت حاصل کرنے کی کوشش کو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے ناپسند کیا تھا۔ اور مسلمانوں نے کچھ زیادہ ہی کیوں کہ انھوں نے اس کے مذہبی تجربات میں اپنے مذہب کے لئے زیادہ خطرہ محسوس کیا تھا۔

اسی طرح شیعوں کے بارے میں اورنگ زیب کے طرز عمل کو واضح کرتے وقت یہ حقیقت بھی بیان کرنی چاہیئے کہ اس کے چار وزیروں میں سے تین شیعہ تھے اور ایک ہندو۔

مثالیں اور بہت سی پیش کی جا سکتی ہیں۔ منشور یہ ہے کہ کسی تعصب کو راہ دئے بغیر بیان کے کاموں کو بجا قرار دینے یا مذمت کرنے کے لئے پہلے سے سوچے سمجھے نظریات کو منطبق کئے بغیر انسانوں اور ان کی تحریکوں کی مکمل تصویر پیش کی جائے۔

ہندوستان میں فن تاریخ نویسی کو سچائی اور صرف سچائی کا پابند رہنا چاہیئے اور نظریات کے تمام اعتبارات کو اور کسی خاص انداز فکر کو زندہ یا قائم رکھنے کی تبلیغی کوششوں سے گریز کرنا چاہیئے۔ کوئی خاص انداز فکر اپنانا حتیٰ کہ اپنے موضوع کے ساتھ فطری ہمدردی رکھنا قابلِ اعتراض نہیں ہے لیکن نظریات کے سانچے میں حقائق کو ڈھالنے کے لئے جان بوجھ کر غلط بیانیوں کو مسترد کر دینا چاہیئے۔ ہر مصنف کو آزادی حاصل ہونی چاہیئے کہ وہ تاریخی مناظر کو جس زاویہ سے چاہے دیکھے اور جب تک وہ سچائی پر قائم رہتا ہے اور قطع و برید نہیں کرتا اس کو صبر کے ساتھ سننا بھی چاہیئے۔ تاریخی تحقیق و تفتیش

کے میدان میں ہزاروں پھولوں کو کھلنے دیجئے کہ اسی میں ہندوستان کے تاریخی مطالعات کا مستقبل پوشیدہ ہے۔

آزادی تاریخی تحقیق کے لئے نئی سہولتیں لے کر آئی ہے اور ماخذی مواد کے وسیع خزانے روشنی میں آرہے ہیں۔ ہماری توجہ بجا طور سے حکمرانوں اور حکمراں خاندانوں سے عوام کی جانب مبذول ہوگئی ہے یہ ملک کے نئے جمہوری تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اس کی پوری کوشش ہونی چاہئے کہ ایک محقق کو ماخذی مواد تک کسی دقت کے بغیر رسائی حاصل ہوجائے۔ گنیزا دستاویزوں کی تازہ کھوج نے بین الاقوامی تجارت میں ہندوستان کی شمولیت کے نئے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ ایک بین الاقوامی تجارتی کارپوریشن جو کارِم کے نام سے معروف تھی (تامل میں کریم بمعنی کاروبار مستعمل ہے) اور جس میں ہندو عرب، عیسائی اور یہودی وغیرہ شامل تھے، بین الاقوامی تجارت میں ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ ان دستاویزات میں ہندوستان کی درآمدات و برآمدات نئی بھی ہیں اور قیمتی بھی۔ لوہے اور فولاد کی چھ قسمیں، تانبہ اور کانسی کے برتنوں کی بارہ اقسام اور پارچہ جات کی متعدد قسمیں خاص طور سے ہندوستانی ململ جس کا ذکر لانی اور لالی کے خوبصورت ناموں سے ملتا ہے برآمدات کی فہرست میں مذکور ہیں۔ لکڑی، مصالحے اور عطریات وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔

گوا میں پرانے کاغذات و دستاویزات کے دفاتر ([illegible]) ایسے دلچسپ ماخذی مواد سے پر ہیں جو پرتگالیوں کی سرگرمیوں اور ان کی تجارتی اور نوآبادیاتی مہموں کے خلاف ہندوستانی حکمرانوں کے ردعمل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ راجستھان کے دفاتر کاغذات قدیمہ میں اڑیسہ اور آندھرا پردیش کے انھیں دفاتر میں ہزارہا ہزار فرامین اور سرکاری دستاویزات موجود ہیں جن کی ترتیب و تدوین باقی ہے۔ علاقائی زبانوں میں دستیاب دستاویزوں کو روشنی میں لانے اور منظم طریقے سے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں

Accession number
...39591.....
Date 15.1.81

جہاں تاریخی مواد اتنا مختلف النوع اور متعدد زبانوں پر مشتمل ہے علاقائی تاریخوں کا متقاضی ہے جو ہندوستانی تاریخ وتمدن کا ایک اہم حصہ ہیں۔ علاقائی مؤرخوں کو مقامی بولیوں اور زبانوں میں پائے جانے والے تمام ادب کی چھان بین کرنے کے زیادہ بہتر مواقع حاصل ہیں۔ لیکن ایسے تمام مطالعوں کو مکمل و متحدہ ہندوستانی منظر کی ہم آہنگ تصویر کشی کرنی چاہیئے اور ہندوستانی زندگی کے اصل دھارے سے ہٹ کر کسی خاص علاقہ کی تاریخ نہیں پیش کرنی چاہیئے۔ ہندوستانی سماج کی تمام بڑی اور چھوٹی تصانیف کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلنا چاہیئے۔ اور ہر قسم کی تعمیم کو علاقائی مطالعوں کی بنیاد پر جانچتے پرکھتے رہنا چاہیئے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں زرعی صورت حال کا جو بیان برنیر کے یہاں ملتا ہے وہ راجستھان اور گولکنڈہ سے متعلق بعض زرعی مطالعوں سے پوری طرح میل نہیں کھاتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخی علمیت کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جنوب مشرقی ایشیا اور مغربی ایشیا کے ملکوں سے زیادہ گہرے تعلقات استوار کرے تاکہ ہماری تاریخ میں ایک وسیع ایشیائی نقطۂ نظر پیدا ہو۔ اس سے ہم کو ایک ایسا خاکہ فراہم ہوگا جو تہذیبی قوتوں کے باہمی عمل اور رد عمل کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ مثلاً شام میں متعدد غیر ملکی ماہرین آثار قدیمہ کی متعدد جماعتیں کام کر رہی ہیں لیکن ان میں ایک بھی ہندوستانی نہیں۔ ان مقامات کا ایک اچھا اور محتاط مطالعہ ہندوستان کے تہذیبی اثرات کے بہت سے دلچسپ پہلوؤں کو اجاگر کرے گا۔ وہ تہذیبیں جو فرات، نیل، سندھ اور گنگا کے کنارے پھلی پھولیں ان کا گہرا اور مفصل مطالعہ کیا جانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ مغربی ایشیائی ممالک کے کتب خانوں کو بہت گہری نظر سے دیکھنا چاہیئے کہ ان میں کتنا مواد موجود ہے جس کا ہندوستانی تاریخ و تمدن سے کوئی تعلق ہے۔ دہلی سلطنت کی تاریخ بارھویں صدی سے شروع ہوتی ہے جب ہندوستانی سماج پر مایوسی کی ایک عظیم دھند چھائی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ سے بہت سے مصنفین کی نگاہ سے ہندوستانی عالموں کے وہ کارنامے اوجھل ہو گئے جو انھوں نے سابقہ صدیوں میں انجام دیئے تھے اور جن کا عرب ممالک پر گہرا اثر پڑا تھا۔ اجازت دیجئے کہ میں تیرھویں صدی سے متعلق اپنی ایک کتاب سے ایک اقتباس پیش کروں:

"گیارھویں اور بارھویں صدی میں ہندوستانی سماج کی ایک دھندلی تصویر کی بنا پر

بہرکیف کسی کی نگاہ سے سابقہ صدیوں میں ہندوستان کے انجام دیے ہوئے ذہنی کارنامے اوجھل نہیں ہونے چاہئیں۔ ترکوں کی آمد سے بہت پہلے ہندو تصانیف نے ریاضیات، فلکیات، نجومیات علم کیمیا، طب، نجوم، حکایات اور سیاسیات کے میدانوں میں عربوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرلی تھی اور ان مضامین کی بہت سی سنسکرت کتابوں کے ترجمے عربی میں ہو چکے تھے۔ لیکن گیارھویں بارھویں صدی کے ہندوستان کا یہ عظیم ذہنی ورثہ بہرحال ہندوستانی عوام کی رسائی سے باہر تھا۔ مسلمان اپنے متعدد علوم کے علاوہ اپنے ساتھ وہ بہت سے علوم بھی لیکر آئے تھے جو انھوں نے بنیادی طور پر ہندوؤں ہی سے مستعار لئے تھے۔"

عربی ادب کا ایک مطالعہ ہندوستانی علمیت پر عرب ممالک کے اثرات اور اس کے برعکس حقیقت کا تجزیہ کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کے پاس بھی بہت کچھ ہے جس سے ملایشیا اور انڈونیشیا کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات کی تاریخ کو سمجھا جا سکتا ہے۔

یہی وقت ہے کہ ہندوستان میں دستیاب تمام مواد کی تنظیم، تدوین اور فہرست سازی کی جائے اور اس کا جائزہ لیا جائے کہ جنوب مشرقی ایشیا اور مغربی ایشیا کے ممالک میں ہماری تاریخ کے لئے کیا چیز قدر و قیمت کی حامل ہے۔ ایسے مطالعوں میں یہ فکر کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کے پیش نظر اس طرح کی کوئی بھی کوشش بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوگی۔ ایک عظیم فرانسیسی مورخ فیسٹل دی کلین Fustel del Coulanges نے ایک بار کہا تھا کہ "ایک دن کے امتزاج کے لئے تجزیہ کے برسہابرس درکار ہوتے ہیں"۔ ہم کو امید رکھنی چاہیئے کہ ہماری کوششیں ایک دن ہندوستان کے تاریخ و تمدن کو اس کے تمام پہلوؤں سمیت مگر تمام تعصبات اور غلط بیانیوں سے پاک دیکھنے میں معاون ثابت ہوں گی۔

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے میں ان خطرات کی جانب توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جو اصطلاحات اور خیالات کے ترجمہ میں مضمر ہوتے ہیں۔ اگر ترجمے اصل معانی سے ہم آہنگ

نہیں ہوتے تو تاریخی فکر مسخ ہو جاتی ہے اور بعد میں تاثرات کو صحیح کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی اداروں کے سلسلہ میں جو ایک قطعی مختلف پس منظر میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے انگریزی اصطلاحات کا بے باکانہ استعمال بہت سے اداروں کو صحیح طور پر سمجھنے میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ اصل اصطلاحات کی احتیاط سے وضاحت کرنی چاہیئے اور مترادفات کے استعمال سے بچنا چاہیئے۔ مغل انتظامیہ کے بارے میں بہت سے غلط تصورات اصطلاحات کے اصل معانی سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوئے ہیں۔ ایک مثال کافی ہوگی۔ انعام کی زمینیں پانے والے حضرات کے لئے معاشی مؤرخین اکثر ائمہ دار کی اصطلاح استعمال ہیں۔ اور وہ ائمہ کو امام (بمعنی مذہبی رہنما) کی جمع سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصطلاح ائمہ نہیں یمہ ہے۔ ترکی زبان میں یمہ کے معنی روزانہ خوراک یا وثیقہ کے ہوتے ہیں۔

دینی آزادی کی ایک فضا، ہر کھرے نقطۂ نظر کے لئے احترام، اور ہندوستان کی تاریخ و تہذیب کو ایک وسیع تاریخی تناظر میں دیکھنے کی مخلصانہ کوشش ہی تاریخ کے فہم و ادراک کے تقاضوں کے ایک جامع تصور تک رہنمائی کرسکتی ہے۔ انڈین ہسٹری اینڈ کلچر سوسائٹی کو اسی آدرش کا پابند رہنا چاہیئے۔